سر سید احمد خان کا سفرنامہ "مسافرانِ لندن" استعمار مخالف بیانیہ

شفاعت یار خان
پروفیسر انگریزی، گورنمنٹ کالج ٹاؤن شپ، لاہور
ڈاکٹر عامرہ رضا
چیئرپرسن شعبۂ انگریزی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

SIR SYED'S'SAFARNAMA E 'MUSAFIRAN E LONDON' A NARRATOLOGICAL STUDY OF ANTI COLONIALISM

Shafaat Yar Khan
Professor of English
Govt. College Township, Lahore

Amra Raza, PhD
Chairperson Deptt. of English
University of the Punjab, Lahore

Abstract

This paper explores narratological techniques of counter-colonial ideas in the travel narrative of Sir Syed Ahmad Khan, namely Safarnama e Musafirana e London (1869). It employs the strategies of contextualist-rhetorical narratology. This exploration contextualises Sir Syed's travel narrative with his contested ideologies of conservative and progressive Muslim thought that has so characterised conflicted image for a century and a half. Sir Syed's desire to support modernisation of Muslim attitudes, and countering the pressures of the readers of his travelogue, to the extent of alienating his readers, are also discussed as narratological evidence of his narrative honesty.Textual evidence Safarnama e Musafirana e London is thus shown to prove that Sir Syed intended his travelogue to be acounter-colonial document.

Keywords:

سرسید، ولیم میور، اسماعیل پانی پتی، ڈی فانٹا، پیٹرک ہوگن، ہندوستان ،لندن، مسافران لندن، نوآبادیاتی، انگریزی، گجراتی، فرانسیسی

سفرنامہ 'مسافرانِ لندن' ہندوستان کی جنگ آزادی کے بعد ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا جب ہندوستان کے لوگوں میں نوآبادیاتی نظام کے خلاف جذبات ابھی تقریروں تک نہیں پہنچے تھے۔مغربی تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ ہندوستان میں قومیت کبھی بھی ایک تاریخی نظریے کے طور پر قائم نہیں ہوئی۔سرسید کے بیانیے سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہ صرف مسلم قومیت کا تصور موجود تھا بلکہ سرسید کی تحریروں کے ذریعے مسلمانوں میں نوآبادیاتی نظام کے خلاف جدوجہد، استعماری حکمتِ عملیوں سے آگاہی اور اس کی تردید کا شعور بھی موجود تھا۔

سرسید کو ہمیشہ سے متنازعہ سمجھا گیا ہے۔انھیں انگریزوں کے ایجنٹ کے طور پر اسلام مخالف امور کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔انگریز انھیں ان کی کتاب 'رسالہ اسباب بغاوت ہند' کی وجہ سے شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔حتیٰ کہ اس کتاب کو بھی بغاوت تصور کیا گیا۔یہ ضرور ہے کہ ان مذکورہ دونوں فریقوں میں سرسید کے ماننے والے بھی شامل تھے اور انھی میں ولیم میور لیفٹیننٹ گورنر جنرل شمال مغربی صوبہ بھی شامل تھے جنھوں نے سرسید کے بیٹے سید محمود کو ایک وظیفہ کے لیے نامزد کیا اور ان کی تعلیم لندن میں ممکن ہوئی۔سرسید کے میور کے ساتھ احسان اور دوستی کے تعلقات تھے مگر شدید نظریاتی اختلافات کی وجہ سے سرسید نے فیصلہ کیا کہ وہ ان کی کتاب "لائف آف محمدؐ" کے جواب میں تحقیق کی خاطر خود بھی انگلستان جائیں گے۔سرسید کو اس فیصلے کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔انھیں اپنی لائبریری بیچنا پڑی اور اپنی جائیداد گروی رکھنا پڑی۔علاوہ ازیں انھیں بہت سی رقم قرض لینا پڑی تاکہ وہ لندن میں سترہ مہینے کے قیام اور اپنی کتاب "خطباتِ احمدیہ" کے ترجمے اور طباعت کے مصارف کو برداشت کرسکیں۔

سرسید نے اپنے سفر کا قصہ سفر کے دوران ہی تحریر کیا۔ان کا یہ سفرنامہ ساتھ ہی ساتھ اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ میں چھپتا رہا۔کچھ ذاتی نوعیت کے خطوط میں بھی سفر کے واقعات بیان کیے گئے جو سفرنامہ کے ساتھ شاملِ اشاعت ہوئے۔

سفرنامہ کی اشاعت کا خیال سرسید کو شروع سے ہی تھا۔اسے انھوں نے لندن میں ہی مکمل کرلیا تھا۔اس کا نام "مسافرانِ لندن" رکھا۔مگر اس کی مکمل اشاعت ۱۹۶۰ء تک نہ ہوسکی۔یہاں تک کہ اسماعیل پانی پتی نے سرسید کے مکمل کام کی اشاعت کا بیڑہ اٹھایا اور مجلس ترقی ادب لاہور نے اسے شائع کیا۔(۱) برصغیر میں جتنا کام سرسید پہ ہوا ہے یا آئندہ ہوگا، وہ اسماعیل پانی پتی ہی کا رہینِ منت ہوگا۔

سرسید کی قصہ نویسی کی حکمتِ عملی ظاہر کرتی ہے کہ انھیں اچھی طرح سے معلوم تھا کہ ان کا سفرنامہ ایک استعمار مخالف دستاویز ثابت ہوگا۔اسی وجہ سے انھوں نے اس کا نام سفرنامہ "مسافرانِ لندن" رکھا۔اس نام سے واقعات میں مرکزی حیثیت مسافروں کو ملتی ہے نہ کہ لندن اور انگلستان کو۔انگلستان کے ہندوستانی سفرنامے اپنا زور انگلستان کے نظاروں پہ ڈالتے تھے مگر سرسید ہندوستانی مسافر کا بیانیہ رقم کررہے

تھے نہ کہ ایک نوآبادیاتی نظام کے تلے دبے محکوم فرد کا تجربہ جس کی آنکھیں انگلستان کے نظاروں سے خیرہ ہو گئی ہوں۔سفرنامہ کا انگریزی ترجمہ مشیرالحسن اورنشاط زیدی (۲) نے حال ہی میں بعنوان A Voyage to Modernism ہندوستان سے طبع کیا ہے جس میں ترجمہ کی غلطیوں کے علاوہ کتاب کے نام کو بھی غلط معنی دیے گئے ہیں ۔اس عنوان سے یوں لگتا ہے کہ ایک پسماندہ قوم کا فرد جدید دنیا کی طرف سفر کر رہا ہے اور اس کا سفر اس کے لیے شخصیت سازی کا بھی باعث ہوگا ۔ یہ وہ بیانیہ ہے جو انگلستان جانے والے کئی ہندوستانیوں کے سفرناموں میں ملتا ہے مگر سرسید کا سفرنامہ، انگلستان کے بجائے مسافروں کے سفری تجربے کو مرکزی حیثیت دیتا ہے ۔انگریزی ترجمہ ہندوستان کو پسماندگی اور قدامت جبکہ انگلستان کو جدت اور نوآبادیاتی بیانیہ کے انداز میں پیش کرتا ہے۔نیز یہ ترجمہ سرسید کے ارادے اور ان کی قصہ گوئی کی حکمتِ عملی کے استعمال کو معدوم کر دیتا ہے۔

سرسید کا سفرنامہ اس لیے بھی مختلف ہے کہ وہ دوسرے سفرناموں کی طرح انگریزی میں ترجمہ کے بجائے اردو میں رہتے ہوئے اپنے بیانیہ کو قائم کرتا ہے ۔سرسید خوب جانتے تھے کہ اسے لندن سے شائع کرنے اور انگریزی میں بیان کرنے کی کیا اہمیت ہے۔بہت سے دوسرے مسافروں نے بھی اپنی کتابوں کا خصوصاً انگریزی میں ترجمہ کروایا تاکہ انگریز حکمرانوں کی عنایت حاصل کر سکیں ۔گاندھی نے اپنی سوانحِ عمری گجراتی میں لکھی مگر فوراً انگریزی ترجمہ بھی کروایا۔ٹیگور نے بھی اپنی یادداشتیں بنگالی میں لکھیں مگر جب انگلستان کے سفر پر روانہ ہونے لگے تو اس وقت اس کا انگریزی میں ترجمہ کروایا۔اگرچہ سرسید نے ''خطبات احمدیہ'' کا ترجمہ کثیر رقم اور محنت سے کروایا مگر اپنے سفرنامہ کو اردو ہی میں رہنے دیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ یہ سفرنامہ انگریزوں کی خوشنودی کے لیے نہیں بلکہ ہندوستانی عوام بالخصوص اردو بولنے والے مسلمانوں کے لیے لکھ رہے تھے۔ان کا خصوصی نوٹ ایک اطلاع نسبت سفر متعصب یا اہلِ تقویٰ وورع (۳) انھی کو مخاطب کر کے لکھا گیا تاکہ ان سے باضابطہ کلام کر سکیں۔

سرسید کا سفرنامہ بنیادی طور پہ ایک سیاسی دستاویز ہے جس میں مصنف کی شخصیت کی تشکیل قصہ گوئی کی تکنیک کے ذریعہ ایک نظریاتی بنیاد پہ ہوئی ہے۔یہ شخصیت اپنے انگریز ملنے والوں اور اپنے قارئین سے نظریاتی اختلافات کو خصوصاً اپنی قصہ گوئی میں مرکزی مقام دیتی ہے۔

اپنے قارئین کے لیے سرسید نے ایک مصلح کا کردار اختیار کیا اور ایسے واقعات بیان کیے ہیں جن سے مسلمانوں کے دقیانوسی خیالات کو خصوصی ضرب لگے ۔اس طرح انھوں نے اس تنقید کو شدت بخشی جو ان کے خلاف عرصہ سے جاری تھی ۔(۴) ہندوستانی مسلمان ابھی یہ فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ انگریزوں یا عیسائیوں سے ملنا درست ہے یا نہیں اور سرسید اپنے واقعات سے ثابت کرنا چاہ رہے تھے کہ ذبیحہ پہ اصرار

کرنا ایسے سفر کے دوران درست نہیں ۔اس طرح اگر چہ سرسید اپنے وقت سے ڈیڑھ سو سال آگے کے فقہی مسائل کو چھیڑ رہے تھے جس سے ان کے قارئین لازماً ناراض ہوتے اور وہ ہوئے بھی ۔مگر ان کا بنیادی مقصد ان فقہی مسائل اور مذہبی طبقے کے خلاف نبرد آزما ہونا نہیں تھا بلکہ ایک استعمار مخالف نظریہ قائم کرنا تھا،جس کی ایک شکل ولیم میور کی کتاب 'لائف آف محمدؐ' کا رّدتھا۔

انگریزی تنقید میں بیانیہ نگاری ایک مستند طریقۂ تنقید ہے ۔مگر بیانیہ ہے کیا؟اس پر بہت بحث ہے۔مک سیکی یعنی ساختیاتی تنقید میں جیرالڈ پرنس کی Narratology: The Form and Function of Nanative (۵) جیراڈ جینیٹ کی Paratexts: Threshold of Interpretation (۶) اور میک بال کی Narratology: Introduction to the Theory of Narrative (1999) (۷) یہ سب انتہائی مختلف اور متصادم تعریفیں بیان کرتے ہیں۔کہانی یا قصہ کو بیان نگاری سے جدا تصور کرنا بھی محال سمجھا گیا ہے جس سے نظریاتی بیان بازی اور واقعہ نگاری میں فرق کرنا مشکل ہوگیا ہے۔چونکہ قصہ نگاری ادب کے علاوہ سیاست اور تاریخ نگاری کے ساتھ ساتھ سماجی علوم اور نفسیات کے واقعات بیان کرنے میں بھی استعمال ہوتی ہے، ان تمام علوم میں ایک واحد تعریف ممکن نہیں۔ ۱۹۷۸ میں چیٹ مین نے Story and Discourse میں لکھا کہ بیانیہ نگاری واقعات کو ایک لڑی میں پرونے کا نام ہے۔(۸) مگر اپنی دوسری کتاب Coming to Terms: The Rhetoric of Narrative in Fiction and Film میں اس نے کہانی اور غیر واقعاتی تحریروں میں فرق کرنے پہ زور دیا ہے۔(۹) تین سال کے بعد پھر اپنی کتاب Reading Narrative Fiction میں وہ سوال اٹھاتا ہے کہ بیانیہ / واقعہ کیا ہے؟ جواب میں لکھتا ہے کہ بیانیہ نگاری کی تحریروں کو سمجھنے کے لیے ہمیں اصلاحات کی ضرورت ہے۔(۱۰) اس کام کو ریمون کینان نے Narrative Fiction: Contemporary Poetics (۱۱) میں بیان کیا ہے کہ واقعہ نگاری آپس میں وابستہ کہانی کے حصوں کو بیان کرنے کا نام ہے ۔اس نے تاریخ ،اخباری خبروں ، رپوٹوں اور سوانح عمریوں کو ایک ہی گروپ کا حصہ قرار دیا ہے۔

اس بحث کے نتیجے میں بیانیہ یا قصہ نگاری کی تاریخ شدت آمیز بحث سے عاری نہیں ہے۔واقعہ، کردار ،حالات ، وقت اور مقام کی بیانیہ نگاری میں بہت اہمیت ہے ۔جدید نقاد کہانی کو نظریاتی بیان رقم کرنے کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں ۔افراد اپنی زندگی کو بیان کرتے ہیں تو اس کا ایک مقصد ہوتا ہے۔

کہانی کے واقعات کا چناؤ اوران کو پلاٹ میں جوڑنا اگر اہم ہے تو بیان کرنے کی تفصیلات بھی اہم ہیں جیسا کہ موقع محل، جگہ،موسم، وقت اور مکالمے۔جب نظریاتی واقعہ نگاری کا معاملہ آتا ہے تو مسئلہ اور

بھی گھمبیر ہو جاتا ہے، کیونکہ یورپ جانے والا پسماندہ ملک کا سیاح جو بیان کرے گا، اس سے اس کی قوم پرستی اور یورپ سے مرعوبیت کا تضاد بھی واضح ہوگا۔

بھابھا کے مطابق قومیت ثقافت سے وجود میں آتی ہے اور تاریخی واقعات کو دوبارہ تحریر کرنا دراصل سیاسی مقاصد کے زیر اثر ہوتا ہے۔(۱۲) قصہ نویسی کی تکنیک کا ذکر کرتے ہوئے ڈی فائنا کا کہنا ہے ہم کہانی کو واقعات کو از سر نو بیان کرنے اور انھیں معانی دینے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔(۱۳) اسی تناظر میں ڈیسمین کہتی ہے کہ قومیں اور حکومتیں اپنی مرضی کے تاریخی واقعات رقم کرتی ہیں جیسا کہ سماجی تحریکیں نسلی گروہ اور افراد اپنے تجربات کی کہانیوں میں کیا کرتے ہیں۔(۱۴)

جدید قصہ گوئی کے طریقوں میں انشا پردازی کو تناظری مطالعے کے ذریعے قصہ بیان کرنے کی تکنیک اور حکمتِ عملی کو ہم آہنگ کر کے سیاسی نظریاتی اور نفسیاتی نتائج حاصل کرنا بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس تحقیق میں وین سی بوتھ کی کتاب The Rhetoric of Fiction (۱۵) اور جیمس فیلن کی کتاب Narrative as Rhetoric: Technique, Audience, Ethics, Ideology (۱۶) میں زیر بحث لائے گئے بیانیہ کے طریقوں کو استعمال کیا گیا ہے۔ اس نئی حکمتِ عملی میں زور دیا جاتا ہے کہ کہانی نویس کیسے اپنے قارئین کے فہم، جذبات اور اقدار پہ اثر انداز ہوتے ہیں۔(۱۷) انشا پردازی کے اس طریقے میں تنقید نگار پہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ تحریر کے اثرات سے اس کے محرکات تک پہنچیں جن سے کہانی کی جزئیات کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔(۱۸) اس تنقیدی حکمتِ عملی میں نظریہ سب سے اہم محرک تحریر سمجھا جاتا ہے۔(۱۹) کہانی کی زبان اور مختلف اسلوبی تکنیک ظاہر کرتی ہیں کہ مصنف کا ارادہ کیا تھا اور اس طرح مختلف الفاظ کا چناؤ مختلف کہانیوں کو جنم دیتا ہے اگرچہ ان کا مواد ایک جیسا ہی ہو۔(۲۰) کہانی کی تحریر کو انشا پردازی کے مطالعے کے ذریعے سمجھنے میں پلاٹ کو بھی قاری کے جذبات کو ایک خاص طرح کی تحریک دینے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح کردار، کہانی کا بہاؤ اور نظریہ ایک اجتماعی مقصد کے حصول کا ذریعہ بنتے ہیں۔(۲۱) ایبٹ اس بات کو واضح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کہانی کی انشا پردازی اس کی طاقت ہوتی ہے۔ اس کا تعلق تحریر کے ان تمام عناصر سے ہوتا ہے جن سے جزئیات اور خیالات کی مختلف جہتیں وجود میں آتی ہیں جنھیں قاری مطالعے کے دوران میں محسوس کرتا ہے۔(۲۲) یہ عناصر فیصلہ کرتے ہیں کہ قاری کہانی کو کس طرح سمجھتا ہے اور اس کے کیا معانی اخذ کرتا ہے۔

جدید نیراٹولوجی کے قریبی روابط نوآبادیاتی نظام کی تحقیقات سے بھی ہیں۔ اس لیے کہ دونوں نوآبادیاتی نظام کی تحریروں میں انشا پردازی کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ نوآبادیاتی نظام کی تحقیق میں اہم ترین کام قصہ گوئی کی تکنیک سے متعلق ہے جو نوآبادیاتی سیاحوں کی تحریروں میں استعماری نظریات کا مطالعہ کرتی

ہے۔جدید نیراٹولوجی نے مفید طریقے وضع کیے ہیں جن سے بالخصوص شناخت اور کہانی نویسی کی تکنیک کا مطالعہ نو آبادیاتی دور کی سوانح عمری اور سفر ناموں میں کیا جا سکتا ہے۔ سارا ملز کی Discourses of Difference (۲۳) ثابت کرتی ہے کہ نو آبادیاتی تحریروں میں وہ تمام تکنیکیں استعمال ہوئیں جو نیراٹولوجی کی تحقیق میں استعمال ہوتی ہیں۔ایڈورڈ سعید کی کتاب Orientalism (۲۴) میں مشرق سے متعلق معروضی دکھائی دینے والی تحریروں میں خصوصی انشا پردازی کے استعمال کو زیرِ تحقیق لایا گیا تھا۔حال ہی میں پرمود کے نائر کی کتاب Colonial Voices: The Discourses of Empire(۲۵) نے ثابت کیا ہے کہ نو آبادیاتی نظام کے تناظر میں لکھی جانے والی تحریروں میں کہانی نویسی اور انشا پردازی کی خصوصی تکنیک اور حکمتِ عملی استعمال کی جاتی تھی۔

کہانی نویسی کی ادبی تحقیق پر انسانی سائنس میں استعمال ہونے والے طریقوں کا بہت اثر ہے۔سو وہ کہانی کو ابلاغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں جس میں واقعات منتخب کیے جاتے ہیں۔انھیں تنظیم اور تعلق کے مراحل سے گزار کے اہم بنایا جاتا ہے تا کہ وہ ایک مخصوص قاری یا سننے والے پر ایک خاص تاثر ڈال سکیں۔(۲۶) یہ نظریہ وین بوتھ اور فیلن کے نظریے سے ملتا جلتا ہے اور یہ دونوں ہی کہانی کے ذریعے مخصوص سیاسی اور نظریاتی نتائج حاصل کرنے کو زیرِ تحقیق لاتے ہیں۔ان کی جدید شکل میں تحقیق جاری ہے کہ کس طرح قصہ گوئی کے ذریعے قومی اتحاد یا عوام پر تسلط حاصل کیا جا سکتا ہے۔پیٹرک ہوگن نے اپنی کتاب Understanding Nationalism:On Narrative,Cognitive Science, and Identity (2009) (۲۷) میں واضح کیا ہے کہ سیاسی قصوں کا تجزیہ کرنا کتنا اہم ہے اور کس طرح قومیت کا نظریہ قصہ گوئی سے انتہائی متعلق ہے۔اس تمام تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ قصہ گوئی کے سماجی اور سیاسی تحریکوں پہ کتنے گہرے اثرات ہوتے ہیں۔ان اثرات کو حاصل کرنے کے لیے قومی نظریات کو پلاٹ کی شکل دی جاتی ہے تا کہ وہ جذباتی عوامل کا کام کر سکیں اور سیاسی اعمال کے لیے محرک کا باعث بنیں۔ہوگن خصوصاً انشا پردازی کا طریقہ اپناتا ہے اور حتمی طور پہ کہتا ہے کہ اہم بات یہ نہیں ہے کہ کوئی عمل مصنف کی کس نیت کا نتیجہ تھا بلکہ اہم بات یہ ہے کہ اس عمل کا کیا نتیجہ نکل سکا۔(۲۸) قوم پرستی کی تحقیق میں ہوگن تاثر انگیزی کی اہمیت کو قومی شناخت کے جزو کے طور پہ اہم قرار دیتا ہے۔تاثر انگیزی سے وہ شناخت کے بارے میں نظریات میں جذبات کا نفوذ مراد لیتا ہے۔(۲۹) سو قوم پرستی کے جذبے میں کہانی نویسی کے طریقے عمل پذیر ہوتے ہیں۔ہوگن کے مطابق قوم پرستی کے نظریات اور اعمال کی ترویج قصہ گوئی کے ڈھانچے اور ساخت سے متعلق ہے اور نظریۂ قوم کی پلاٹ سازی ہمارے جذباتی ردِ عمل سے لازم و ملزوم ہے۔(۳۰) حال ہی میں مشہور ہونے والے Grand narratives; اور National narrative

جیسے جملہ نظریاتی ہدف استعمال کرنے کے مقصد سے قومیت کی ترویج کے لیے عمومی استعمال میں آنے لگے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ انشا پردازی، قصہ گوئی اور قومیت باہم وابستہ ہیں ۔

اسی سلسلے میں ڈی فانا اور جورجا کوپولو کے منتخب شدہ مضامین جوان کی کتاب The Handbook of Narrative Analysis(۳۱) میں شائع ہوئے ،اس تحقیق کی ترویج کرتے ہیں کہ کردار، واقعات اور نیک وبد کی تمیز کا تعلق زبان کے خصوصی انتخاب اور کہانی کی جزئیات کو معنی خیز انداز میں پرونے سے وابستہ ہے۔(۳۲) کہانی کے ذریعے شناخت کی تعمیر وتشکیل پر روشنی ڈالتے ہوئے بیم برگ، ڈی فانا اور شفرن نے واضح کیا ہے کہ مصنف کی نظریاتی مقصدیت جو مکمل تحریر کا باعث ہوتی ہے، کہانی میں شریک کرداراورعوامل کو معنی عطا کرتی ہے جس سے وہ خصوصی اعمال سرانجام دے سکیں ۔(۳۳) سوانح عمری کے مصنفین بھی اسی طرح اپنے تجربات اور واقعات کو منتخب کرتے ہیں۔ان کی تدوین کرتے ہیں تاکہ وہ مجموعی طور پر اس مقصد کو پورا کرسکیں جس کے لیے ان کی کہانی ایک خاص انداز میں ایک خاص ترتیب سے بُنی جاتی ہے۔انتخاب اور ترتیب کی حکمتِ عملی کی روشنی میں تمام وضاحتی اور تشریحی کام کی تحقیق کو دیکھنا چاہیے کہ قصہ گوخود کو اپنے قارئین کے مقابلے میں کیسے بیان کرتا ہے ۔(۳۴) بوتھ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ کس طرح سوانح عمری لکھنے والے اپنی شخصیت کے ان پہلوؤں کو معدوم کردیتے ہیں جنھیں وہ پسند نہیں کرتے یا ناموزوں سمجھتے ہیں ۔(۳۵) وہ اس عمل کو Literary masking یعنی ادبی چہرہ وضع کرنا (۳۶) اور Rhetrickery (۳۷) یعنی سیاستدانوں کے بددیانت طریقے کہتا ہے۔

یہ تحقیق مندرجہ بالا نظریات کی روشنی میں سرسید کے سفرنامہ میں کہانی نویسی کی تکنیک کا مطالعہ اس غرض سے کرتی ہے کہ واضح کرسکے کہ سرسید نے قومی شناخت اور نظریے کو اپنے سفرنامہ میں کس طرح ردِ استعمار کے طور پر استعمال کیا ہے اور کس طرح کہانی ،کردار، اور واقعات کی بُنت ان کے سیاسی مقاصد کو واضح کرتے ہیں ۔پیٹرک ہوگن نے قومی قصے کی بناوٹ میں ایک اہم تکنیک کی شناخت کی ہے جسے وہ Salience (۳۸) یعنی نمایاں انگیزی کا نام دیتا ہے جس کا مقصد خاص نظریات کو کہانی، کردار، واقعات ،تکلم اور انتخابِ الفاظ کے ذریعے کسی خاص نظریے کو نمایاں حیثیت دینا ہے۔سرسید کے سفرنامہ کا گہرا تعلق نوآبادیاتی تسلط کے خلاف مسلم سیاسی تحریک سے ہے۔ اس لیے یہ تحقیق ہندوستان میں ابھرنے والی ردِ استعمار اور تسلط مخالف کہانیوں اور کہانی نویسی کی تکنیکوں کی آفرینش کو سرسید کے سفرنامہ میں قرار دیتی ہے۔

پسماندہ ہندوستان سے انگلستان کا سفر کرنے والوں کے سفرنامے میں مغربی ترقی کا بیان اور اس کا مشرق کی پسماندگی سے موازنہ فطری امر ہے ۔مگر اس بیان کے تجربے کو کتنی اہمیت دی جاتی ہے، اس کے ساتھ اور کون سے بیان تحریر کیے جاتے ہیں، دوسرے اور کون سے خیالات و واقعات کا بیان کرنا ضروری سمجھا

جاتا ہے؟ یہ وہ جزئیات ہیں جن سے نظریاتی بیانیہ وجود میں آتا ہے۔اس بیانیے کے لیے کون سی انشا پردازی کی تکنیک کا استعمال کیا جاتا ہے۔یہ فیصلہ کرنے میں مدد کرتے ہیں کہ بیانیہ نگار کا مقصد کیا تھا اور وہ اپنے قارئین پہ کیا تاثرات مرتب کرنا چاہ رہا تھا۔

سرسید کے سفرنامہ کی واقعہ نگاری ان کے استعمار مخالف نظریات کی راہ ہموار کرتی نظر آتی ہے۔ چند خاص جزئیات پر زور دے کر وہ ایک ردِ استعمار تحریر رقم کرتے نظر آتے ہیں۔اس طرح کے بیان میں ان کے سفر کے تجربے اور اپنے ہم سفروں پر زور دینا ان کے سلطنتِ برطانیہ کی شان کے بیان سے متصادم ہے۔ان کے لیے انسان اہم اور عظمتِ سلطنتِ انگلستان ثانوی اہمیت کی حامل ہے۔انگریزوں سے روابط کے بیان میں بھی وہ فرد اور انسانیت پر زور دیتے ہیں بجائے اس کے کہ انگریزوں کے عہدے اور ان کی حاکمانہ خاصیتیں بیان کریں۔ردِ استعمار ان کے انگلستان دشمن قوموں کے بیان میں بھی نظر آتا ہے۔یہی نظریاتی اختلاف انھیں انگریزی کے مقابلے میں اردو اور فرانسیسی پہ زور دینے کا بیانیہ برملا رقم کرنے پہ مجبور کرتا ہے۔یہ موازنہ وہ نہ صرف یورپی اور ہندوستانی عمارات وغیرہ کے تقابل میں واضح کرتے ہیں بلکہ انگریزی اشیاء، مقامات وغیرہ کا فرانسیسی اشیا اور مقامات سے مقابلہ کر کے فرانسیسی کو بہتر قرار دیتے ہیں۔ان تمام کی شہادتیں ان کی تحریر میں جا بجا نظر آتی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ سفرنامہ خصوصاً ان تجربات مشاہدات اور نظریات کا ایک خاص بیانیہ رقم کرنے کی خاطر تحریر کیا۔

سرسید کا سفرِ انگلستان ان کے بیٹے سید محمود کو اعلیٰ تعلیم کا وظیفہ ملنے کی وجہ سے ممکن ہوا۔اس سفر کے مختلف محرکات تجویز کیے گئے ہیں۔(۳۹) یہ خیال کہ ان کے سفر کی وجہ ان کو مستقبل میں ملنے والے اعزاز یعنی سی۔ایس۔آئی کو ذاتی حیثیت میں وصول کرنا تھا، سرسید کے اپنے بیان سے غلط ثابت ہوتا ہے۔سرسید کا سفرِ انگلستان صرف ولیم میور کی کتاب The Life of Mahomet and History of Islam to the Era of the Hegira (۴۰) کے مخالف ایک دستاویز ترتیب دینا تھا۔ولیم میور شمال مغربی صوبہ کے لیفٹیننٹ گورنر اور سرسید کے آفیسر تھے۔میور نے ان کے بیٹے کے وظیفہ میں بھی کلیدی کردار ادا کیا تھا۔سرسید کے ان سے قریبی مراسم تھے۔اس کے باوجود سرسید کو ولیم میور کی کتاب کا بہت قلق تھا اور وہ اس کو رد کرنے کی خاطر انگریزی لائبریریوں میں انگریزوں کی کتابیں ڈھونڈ کر اس کی تردید میں ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے۔(۴۱) سفرنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں زور سفرِ انگلستان پر ہے بجائے انگلستان میں قیام کے۔سرسید کا سفر (1 اپریل تا 4 مئی) ان کی تحریر کا دو تہائی سے زیادہ ہے۔انگلستان آمد اور قیام جس میں بہت سے ذاتی خطوط بھی اب شامل ہو گئے ہیں، زیادہ تر خطبات احمدیہ کے بارے میں ہیں جب کہ سفرنامہ کی تحریر لندن پہنچنے پہ ختم ہو جاتی ہے۔(۴۲)

سرسید پر انگریزی حکومت کا کارندہ ہونے کا الزام بعض وجوہ کی بنا پر لگایا جاتا ہے۔ اول تو یہ کہ وہ انگریزی حکومت کے محکمہء قانون میں ملازم تھے۔ بحیثیت سمال کاز کورٹ کے جج کے سرسید کے پاس وجہ شہرت صرف ان کا مغربی تعلیم اور طور طریقوں کے حمایت کے کچھ اور نہ تھی۔ سرسید کے بیان میں مصلح کی زبان میں شہرت پسندی کی آمیزش تھی۔ لوگوں کے سامنے آج بھی ان کی ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں کی تلخ تنقید رہتی ہے اور ان کی نیت اور خلوص ہوا ہو جاتا ہے۔

اپنے سفرنامہ میں سرسید نے ہر دل عزیز اور متنازعہ نہ ہونے کا کوئی موقع جانے نہیں دیا۔ ان کی مصلحانہ آواز کی تلخی میں وہ کاٹ ہے کہ ان کی خلوص بھری سوچ دب جاتی ہے۔ بلگام کے سٹیشن پہ تین برہمنوں کو ذات پات اور مذہب سے قطع نظر تمام مسافروں کو پانی پلوانے کے لیے بلانے کا نظارہ ان کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ تحریر کریں۔ ''اس وقت مجھے اپنے ملک پر افسوس آیا۔''(۴۳) اس طرح بمبئی کے میمن ان کی تنقید کے نشتر تلے آتے ہیں تو ان کے تمام عیب کھل پڑتے ہیں۔(۴۴) فرانسیسی معمار سوئز کا جذبۂ قومیت ان سے کہلواتا ہے ''میں نے اس دلاور آدمی کی اس فیاضی پر کہ اپنی قوم کی نام آوری پر ایسا غش ہے کہ اپنی خوشی اور اپنی عزت اس میں سمجھتا ہے، ہزار آفرین کی اور اپنی قوم پر جن کا کام بجز حسد اور بغض اور اپنی ذاتی جھوٹی شیخی جتانے کے اور کچھ نہیں ہے افسوس کیا اور یقین جانا کہ ایسی ہی بدخصلتوں سے ان کو ایسی بدنصیبی وذلت نے گھیرا ہے۔''(۴۵)

سرسید کے کلمات ان کے سفر کے ساتھ ہی ساتھ ڈاک کے ذریعے ہندوستان پہنچ رہے تھے اور جیسے جیسے ان کے جملوں میں شدت آ رہی تھی، ان کے خلاف طوفان کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ رہی سہی کسر ان کے مضمون ایک اطلاع نسبت سفر متعصب یا اہل تقوی و ورع (۴۶) نے پوری کر دی جو سفر کے اختتام سے قبل انھوں نے لکھا۔ اس مضمون میں انھوں نے نہ صرف انگلستان کا سفر نہ کرنے کے خلاف دلیلیں دیں بلکہ غیر ذبیحہ مرغی کھانے کو اپنا اختیاری عمل قرار دے کر اس کے حق میں بحث شروع کر دی۔ غیر ذبیحہ کھانے کا معاملہ کئی جگہ بیان میں آیا ہے۔(۴۷) شراب نہ پینے کی حرمت ان کے سامنے دم توڑ جاتی ہے۔ اس سے سرسید نے شرعی مسائل کی ایک بحث شروع کر دی جس کا انھیں بخوبی احساس تھا اور جس کو انھوں نے مہیب آواز کا نام بھی دیا تھا(۴۸) اس پہ مستزاد سرسید نے جا بجا مغربی لوگوں کی تعریفوں کے پل باندھے ہیں۔(۴۹) صفائی، نظم وضبط، اخلاق اور قوم پرستی کے ضمن میں وہ تعریفوں کے پل باندھ دیتے تھے۔ جہاز رانی پہ کہا ''حقیقت میں یورپ کی قوم نے علم جہاز رانی کو نہایت درجے کی ترقی پر پہنچا دیا ہے۔''(۵۰)

اسماعیل پانی پتی نے سرسید کے تاثرات کو نمایاں جگہ دی ہے اور ان کی قوم پرستی کو اجاگر بھی کیا ہے۔(۵۱) مگر سرسید کے اپنے بیانات انھیں متنازعہ بنانے کے لیے کافی تھے" جس خوبی اور خوش سلیقگی سے اور انتظام اور صفائی سے وہ مسافروں کی سرائے آراستہ تھی ہندوستان کے کسی نواب صاحب یا راجا صاحب کے اجلاس و دربار کا بھی مکان آراستہ نہیں دیکھا (چپ چپ! ایسا مت کہو، ہندوستان کے لوگ ناراض ہوں گے)۔(۵۲) سرسید کے ڈسکورس میں ان کا بیانیہ چھپ جاتا ہے کیونکہ ان کی کہانی نگاری میں بحیثیت سیاح ان کے تاثرات واحساسات کو قصہ نگاری کی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ یہ بات کہ وہ مکمل ہوش اور سوچ (Narratology) سے اپنے تاثرات رقم کر رہے تھے اس اہم نکتے کو زیر بحث لائے بغیر موضوع گفت گو ہے کہ دراصل سرسید اپنی قصہ نگاری میں اپنے لیے ایک کردار سازی (Characterisation) کے عمل کو استعمال کر رہے تھے۔ انھوں نے واقعات کو یادداشت اور تاثرات کے عمل کے ساتھ ساتھ ایک تصوراتی عمل سے بھی گزارا جو افسانہ نگاری کے تصوراتی عمل سے کسی طرح مختلف نہیں تھا۔ وہ اسی طرح اپنے لیے ایک کردار تخلیق کر رہے تھے جسے افسانے میں واحد متکلم کہا جاتا ہے۔ منٹو کے افسانوں میں استعمال کیا گیا "میں" ان کی ذاتی شخصیت نہیں ہے اور نہ ہی افسانہ ان کی ذاتی سوانح کا حصہ ہے۔ یہ "میں" افسانے کا ایک کردار ہے جو اتنا ہی غیر حقیقی ہے جتنے باقی کردار ہیں۔ وین بوتھ نے اس سلسلے میں بہت اہم کام کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب The Rhetoric Fiction (۵۳) میں واضح کرتا ہے کہ مصنف تین طرح کے ہوتے ہیں، ایک تو حقیقی انسان۔ گوشت پوست کا لکھاری (Flesh and Blood Author) جو حقیقت میں قلم استعمال کرتا ہے اور اس کے علاوہ ایک وہ مصنف جو اول لکھاری اپنے آپ کو دکھانا چاہتا ہے (Implied Author)۔ یہ مصنف اپنے آپ کو بعض مخصوص شخصی اشاروں سے اپنی زبان والفاظ یا علمیت سے یا صرف اپنے تاثرات سے قاری کے سامنے پیش کرتا ہے جیسا کہ چاسر (Chaucer) خود کو احمق اور بھونڈا بتاتا ہے جبکہ وہ انتہائی چالاکی اور مہارت سے پوری The Canterbury Tales لکھ رہا تھا۔ بوتھ کی اصطلاح میں حقیقی مصنف (The Real Author) اور جسم و جان والا مصنف (Flesh and Blood Author) مختلف ہو سکتے ہیں۔ ہم Implied Author کو مصنفِ مضمر کہہ سکتے ہیں کیونکہ وہ لکھاری کے حصہ میں مضمر ہوتا ہے اور اس کو قاری ٹول کے سمجھ سکتا ہے اور بحیثیت ایک تاثر کے کہانی کے مصنف کے طور پہ جانتا ہے۔ یہی وہ "میں" ہے جو منٹو کے افسانے میں نظر آتا ہے۔

سرسید نے اس "میں" کو ایسے تراشا ہے جیسے منٹو اور چاسر نے۔ اس "میں" کو رقم کرنے میں سرسید کی بیانیہ نگاری کی ضروریات شامل تھیں اور سرسید کی زندگی، مقاصد اور سفر کے سیاق وسباق کے بغیر اس "میں" کو سمجھنا ممکن نہیں۔

کہانی نویسی میں سرسید اپنے اعزاز اور انگریز امرا سے میل جول کو قطعی اہمیت نہیں دیتے۔(۵۴) وہ ۸ دسمبر ۱۸۶۹ء کو ملکہ وکٹوریہ کے جلوس کو سطحی بیان کرنے کے بعد برسبیل تذکرہ لکھتے ہیں کہ وہ اعزاز سٹار آف انڈیا لینے کے لیے شاہی دربار جائیں گے۔(۵۵) کہانی نویسی کے اس پہلو سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید کو لندن کے امرا اور شاہی خاندان کے ساتھ تعلقات کا ذکر کر کے اپنے مقام کو ارفع کرنے سے کوئی غرض نہ تھی۔انھیں اس کو عمومی خبر بنانے سے بھی احتراز تھا۔سرسید کی استعمار مخالف تکنیک کا تقاضا یہی تھا کہ وہ ایسی باتوں کو غیر اہم قرار دیتے ہوئے کم سے کم نمایاں کریں۔

سرسید کے ذاتی خط کتابت سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں خود سے زیادہ اپنے ملک کی بہتری کا خیال تھا۔(۵۶) اگرچہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ان کے اعزاز کا ذکر ہوتا رہا (۵۷) مگر سرسید کے سفر نامہ کا زور ان کی ''خطبات احمدیہ'' کی تحقیق پر ہی رہا۔اعزاز کے بارے میں مندرجہ بالا جملہ ایک لمبے خط کے آخر میں تحریر ہوا جس میں سرسید ولیم میور کی کتاب کو رد کرنے کی تحقیق کا ذکر کرتے ہیں جس کے آخر میں صرف پس تذکرہ خیال کے طور پہ وہ یہ ذکر بھی کر دیتے ہیں۔(۵۸) بلکہ وہ اس انگریزی اعزاز کو اپنے روحانی اعزاز کے مقابل رکھتے ہوئے اپنی حقیقی کامیابی ولیم میور کی کتاب کو رد کرنے کو قرار دیتے ہیں (۵۹) اور اپنا حقیقی تمغۂ شہنشاہی کہتے ہیں۔(۶۰) ''خطبات احمدیہ'' کی اشاعت ترجمہ کے اخراجات نے سرسید کو دیوالیہ کر دیا تھا جس کا ہر جگہ ذکر کرتے ہیں اور امرا کے ساتھ میل جول کا ذکر برسبیل تذکرہ ہی ہوتا ہے۔ایک اور جگہ خط کے درمیان وقفہ ظاہر ہوتا ہے جب وہ بیان کرتے ہیں کہ انڈیا کے وائسرائے لارڈ لارنس کی آمد کی وجہ سے وہ رک گئے تھے اور اب دوبارہ لکھنا شروع کر رہے ہیں۔(۶۱) اس سرسری ذکر سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید کے دل میں لارڈ لارنس کی کتنی وقعت تھی اور وہ ذاتی خط میں اس کا ذکر کرنا کتنا غیر اہم سمجھتے تھے۔کوئی اور مصنف شاید ان کی آمد کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتا، لارڈ لارنس کے بارے میں کئی پیرے لکھ دیتا مگر سرسید اس واقعے کے بیان میں ایک جملے سے زیادہ لکھنا گوارا نہیں کرتے۔ایک خط میں سٹار آف انڈیا کا ذکر ان کی کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' کے بیان میں اسی سرسری انداز میں آتا ہے (۶۲) اور زیادہ اہمیت اس بات کو دی جاتی ہے کہ انگلستان کی رائے عامہ پر اثر انداز ہونے والے لوگوں پر سرسید کی کتاب کا کیا اثر تھا۔قصہ گوئی میں نمایاں کرنے کی تکنیک کے مطابق سرسید کی تحریروں میں انگریزی اعزازات کو کم جگہ دینا ان کی رد استعمار آئیڈیالوجی کا تقاضا تھا۔

سرسید کے رد استعمار بیانیہ کا تقاضا تھا کہ وہ انگریزی کرداروں کو ایسے بیان کریں کہ ان کی ستائش کا پہلو نہ نکلتا ہو۔پس سفر کے دوسرے مسائل کے ساتھ یہ مسئلہ بھی بیان کرتے ہیں کہ جہاں جہاں وہ پہنچے، انگریزوں نے پہلے سے کمروں پہ قبضہ کیا ہوا تھا۔''دیکھا کہ تمام کمرے انگریزوں اور میموں اور بچوں سے

بھرے ہوئے ہیں۔" (۶۳) اسی طرح مزید لکھا "اس جگہ ایک ڈاک ہے وہاں بھی بہت سے انگریز اور میم اور بچے اترے ہوئے تھے۔" (۶۴) واضح رہے کہ سرسید یہ سب کچھ یہ جانتے ہوئے لکھ رہے تھے کہ اس تحریر کو ہندوستان جانا ہے اور سفر کے دوران ہی شائع ہونا ہے۔ اس کے اثرات ان کے انگلستان میں قیام اور انگریزی سرکار سے روابط پر بھی پڑ سکتے تھے۔ مگر سرسید نے اس کا خیال نہ کرتے ہوئے لکھا کہ انگریز ہندوستان میں مختلف انسان ہوتے ہیں۔ جہاز میں ان کا اخلاق مثالی ہو سکتا ہے مگر کیا ہندوستان میں ان کا رویہ بدل نہیں جاتا، اس بات کو سرسید نے یوں بیان کیا:

"ہماری طرف کا کوئی انگریز جہاز میں نہیں ہے اور اس سبب سے میں نہیں جان سکتا کہ جب یہ صاحب لوگ ہندوستان میں تھے تو ان کا مزاج اور اخلاق کیسا تھا مگر جہاز میں سب کا مزاج نہایت اچھا اور بااخلاق ہے --- یا تو یہ صاحب ہندوستان میں بھی ایسے ہی خوش مزاج ہوں گے یا آب و ہوا کا اختلاف اس کا سبب ہوگا۔" (۶۵)

اس بارے میں یہ امر زیر بحث لانا ضروری ہے کہ نوآبادیاتی نظام میں حاکم قوم کو نظر اٹھا کے دیکھنا ممنوع قرار پایا تھا جس طرح مشرقی عورت کو اپنے شوہر کو اور غلام کو اپنے مالک کو دیکھنا منع ہو ویسے ہی انگریزوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا منع تھا۔ ادب میں اس کی جا بجا مثالیں ملتی ہیں جس میں انگریز کا سراپا بیان کرنا جائز نہیں تھا۔

بیل ہکس نے اس کو Oppositional gaze کا نام دیا ہے جس سے سیاہ فام لوگوں کا سیاسی مزاحمت کا علم بلند کرتے ہوئے اپنے حقِ نگاہ / نظارہ کے لیے اٹھ کھڑے ہونا مراد لیا جاتا ہے۔ ہکس کے مطابق گھورنے کا حوصلہ محکوم کو عمل پزیر ہونے پر ابھارتا ہے کیونکہ وہ گھورنے کے عمل سے حقیقت کو تبدیل کر دیتا ہے:

By Courageously looking, we defiantly declared: "Not only will I stare. I want my look to change reality" (۶۶)

چنانچہ سرسید کا انگریزوں کو زیر بحث لانا، ان کو مختلف حالات اور مسائل میں بیان کرنا اسی طرح کی Oppositional gaze کی مثال ہے۔ اس بیان سے اس خیال کی نفی ہوتی ہے کہ انگریز اس لیے حاکم ہیں کیونکہ ان کی بعض خصوصیات تمام انسانوں کی خصوصیات سے ارفع ہوتی ہیں۔ ایک عمومی خیال تھا کہ انگریزوں کو سمندری سفر تنگ نہیں کرتا جبکہ ہندوستانیوں کو چکر متلی وغیرہ کا عارضہ ہو جاتا ہے۔ سرسید اس کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"انگریزوں کو کسی قدر تغیر تھا اور تین چار میموں کو بہت زیادہ تغیر تھا۔ مسز اسمتھ بھی پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا حال؟ اشارہ سے کہا کہ سر پھرتا ہے، طبیعت اچھی نہیں۔ ایک

میم صاحبہ کو میں نے دیکھا کہ منہ سے بے اختیار بہت سے کف اور بت، ذرا سی ایکائی کے ساتھ نکل پڑے۔"(٦٧)

اسی طرح کی تفصیل ہندوستانی افراد کے بارے میں نہیں دی گئی صرف ہلکا سا ذکر آتا ہے۔ انگریز حکمرانوں کو اس طرح بے مروتی سے ایسی حالت میں بیان کرنا سرسید کے اس بیانیہ کا حصہ تھا کہ انگریز کوئی آسمان سے اتری مخلوق نہیں بلکہ عام انسان ہیں اور ان سے وابستہ مافوق الفطرت خصوصیات جھوٹ کا پلندہ ہیں۔ اسی غرض سے انھوں نے انگلستان میں داخلے سے قبل کے منظر کو بیان کرتے ہوئے لکھا: "جو لیڈیاں ہم سے پہلے چلی آئی تھیں وہ لیٹی ہوئی ہیں اور آنکھیں بند کر کے سونے کا قصد کر رہی ہیں تا کہ سونے کی حالت میں وہ رستہ طے ہو جائے گا۔"(٦٨) مرزا خداداد کے بیان میں انھوں نے اضافی طور پر یوں لکھا کہ جیسے وہ ایک انگریز خاتون پہ قے کر سکتے تھے۔(٦٩) منظر کو مکمل کرنے کے لیے لکھا کہ "اور بہت سے انگریز اور لیڈیاں قے کرتی تھیں اور پڑ پڑ جاتی تھیں۔"(٧٠)

اس بیان میں انگریزوں کو ایک انسانی مگر مضحکہ خیز حالت میں دکھایا گیا جس کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ انگریزوں کو ہندوستانیوں کے درجے پر اتار دیا جائے اور انھیں گوشت پوست کا انسان دکھایا جائے۔ سرسید کی یہ تحریر اس وقت اہم لگتی ہے جب ہم دوسرے سیاحوں کے سفرناموں میں یہ خاص منظر غیر حاضر پاتے ہیں اور اس کے مقابل یہ بیانیہ پڑھتے ہیں کہ انگریزوں کو تو سمندری سفر میں کچھ نہیں ہوتا۔

سرسید کے بیانیہ میں صرف یہی نہیں انگریزوں کو پُرتمسخر حالت میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ نہر سوئیز پر جانے کے لیے سواری کے بیان میں سرسید نے انگریزوں کے گدھوں پہ سوار ہونے کے منظر کو اہم جگہ دی ہے۔ گدھے کی سواری ہندوستان میں مختلف معنی رکھتی ہے اور عموماً بے عزتی کے ضمن میں بیان کی جاتی ہے۔ کسی کو گدھا کہنا بھی انتہائی درجے کی بے عزتی کے مترادف ہوتا ہے۔

سرسید لکھتے ہیں کہ "جس وقت کوئی انگریز گدھا کرایہ کرنا چاہتا تھا اس وقت عجیب سیر ہوتی تھی۔"(٧١) یعنی خوب مزے کا منظر ہوتا ہے۔ "گدھے والوں نے جہاں دیکھا کہ گدھا کرایے کو چاہتے ہیں اور دس دس بارہ بارہ آدمی اپنے اپنے گدھے لے کر دوڑے اور ہر شخص ایک کے گدھے کو دھکا دے کر ہٹاتا ہے، اپنا سامنے کرتا ہے اور چلاتا ہے کہ "ڈنکی سر"، ڈنکی سر ڈنکی سر، یعنی 'صاحب گدھا' صاحب گدھا اور کبھی یہ کہہ کر چلاتے تھے "ویری گڈ ڈنکی سر، ویری گڈ ڈنکی سر، یعنی صاحب بہت اچھا گدھا، صاحب بہت اچھا گدھا۔"(٧٢) اس بیان میں سرسید نے مضمر کیا ہے کہ کس طرح انگریزوں کو گدھا کہا جاتا تھا۔ یہ لطیفہ اردو پڑھنے والوں کے لیے لکھا گیا تھا جن کی اکثریت مسلمان تھی اور جو ابھی غدر کے بعد کی سزاؤں اور مظالم کو بھولے نہیں تھے۔

اس کے علاوہ سرسید نے انگریز ہم سفروں کے بیان میں اپنے انتخاب کے حق کو واضح کیا ہے۔ ردِ استعمار بیانیہ اس کا متقاضی تھا کہ سرسید انتخاب کریں کہ انھوں نے کون سے واقعات قصہ میں شامل کرنے ہیں اور ان کا پلاٹ کیسے مرتب کرنا ہے۔ساتھ ہی ساتھ ان کا اپنے ہم سفروں کا بیان کیسا ہوگا اسی بیانیہ کا اہم جزو تھا۔ جب کہ باقی سفرنامے سفر انگلستان کی اہمیت واضح کرتے رہ جاتے ہیں اور ہر بندرگاہ کے قیام کو انگریزی حکومت اور فوجی تعمیر کے بیان سے وابستہ کردیتے ہیں (جیسا کہ لطف اللہ، مرزا ابو طالب وغیرہ) سرسید کے لیے ان کے ہم سفر اور گفتگو زیادہ اہم ثابت ہوتے ہیں۔وہ خصوصاً اپنے ساتھیوں کا ذکر کرتے ہیں اور ان کے بارے میں چھوٹی چھوٹی جذباتی اہمیت کی باتوں کا بیان کرتے ہیں۔(۷۳) یوں لگتا ہے کہ سرسید کے لیے انگلستان کے سفر کی سنسنی انگیزی سے زیادہ اپنے ہم سفروں سے تعلق اہم تھا اور سلطنت انگلستان کے مقابلے میں دوران سفر ملنے والے انسانوں سے روابط زیادہ اہم تھے۔سو وہ بمبئی میں کئی لوگوں سے اپنی گفتگو کو بیان کرتے ہیں۔(۷۴) ٹیلر کے ساتھ دوستی اس لیے ہوتی ہے کہ اس کا تعلق بھی غازی پور اور بنارس سے تھا (۷۵) اور اسکندریہ کے ملاح حاجی احمد بکری سے عربی میں گفتگو کا بیان بھی آتا ہے جسے ہندوستان کا کچھ علم نہ تھا۔سرسید میجر سمتھ کی بیٹی کو جس کا نام آئیڈا تھا خصوصی یاد کرتے ہیں اور اس کی چہچہاتی ہوئی آواز کا ذکر کرتے ہیں جس میں وہ اکثر ان کے پاس آکے ان سے بے تکلف گفتگو کرتی تھی۔(۷۶) ان تمام کا ذکر بحیثیت انسان کے آتا ہے اور نہ اس لیے کہ وہ انگریز یا غیر ملکی تھے۔اپنے افسر اعلیٰ اور محسن ولیم میور جنھوں نے سید محمود کا وظیفہ بھی ممکن بنایا تھا، ایک جملے میں ان کے بارے میں بیان کردیتے ہیں کہ وہ چار بجے ان سے مل کے ہوٹل واپس آئے۔(۷۷) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ میور کو اپنے قصہ میں کتنا کم نمایاں کرنا چاہتے تھے۔اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اس کے بعد گوڈیل جوڑے کے ساتھ اسی رات کو چائے پینے کا تفصیلی بیان آتا ہے جس کو سرسید زیادہ اہمیت یعنی زیادہ تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ ولیم میور کا بیان ان کے القاب وآداب کے ساتھ کرنے سے سرسید ان سے ذاتی مراسم کی اہمیت کو کم کردیتے ہیں جو ضروری تھا کیوں کہ سرسید کا ردِ استعمار بیانیہ میور کی کتاب کے مخالف تحقیق سے متعلق تھا۔

سرسید کے ردِ استعمار بیانیہ کی نظریاتی بنیادیں استعماری ذہنیت کو للکارتی دکھائی دیتی ہیں۔ میجر جنرل بیگنگٹن جنھوں نے ان سے ملنے میں پہل کی (۷۸) سرسید کی نظروں سے اتر گئے جب انھوں نے مس کارپینٹر کی کتاب میں لکھا کہ ہندوستانی بے درد اور احسان فراموش ہوتے ہیں۔(۷۹) سرسید نے اس کا خصوصی ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان کوئی ہم آہنگ ہونے کی گنجائش نہیں پائی جاسکتی۔(۸۰) سرسید نے تاریخی طور پر نظریہ رقم کردیا کہ ان دونوں کے ایک دوسرے کے بارے میں عجیب مفروضے ہیں اور جو بے شک غلط ہیں۔سرسید کے سفرنامہ میں عیسائیوں میں دلچسپی لینا ان مفروضوں

کی تردید کی کوشش لگتی ہے جیسا کہ وہ ان کی نماز کے دوران آس پاس پھرتے رہے اس خیال کے ساتھ کہ خدا کا ذکر جہاں بھی ہو قابل احترام ہے۔(۸۱) اس موقع پر انھیں خدا کی عظمت و رحمت کا بھی خیال رہا۔(۸۲) مگر جب ایک عیسائی دوست نے کہا کہ خدا دونوں کا ایک ہے تو سرسید نے اسے ماننے سے انکار کیا اور بتایا کہ اس عبادت میں یہی ایک کمی تھی۔(۸۳) یہی ردعمل لیفٹیننٹ لارنس کے ساتھ مذہبی بحث میں ضبط تحریر میں آیا(۸۴) اور میجر ڈوڈ سے گفتگو میں سرسید نے زور دیا کہ ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشنز کو لا مذہب ہونا چاہیے۔(۸۵) میجر ڈوڈ سے مذہبی اور نوآبادیاتی نظام حکومت پر بحث کے قصوں میں(۸۶) اگرچہ سرسید نے میجر صاحب کو اپنے مہربان دوستوں میں گنا مگر ان کے چبھتے ہوئے جملوں کا ذکر ضرور کیا اور تحریر کیا کہ آمریت کے رویوں کی تعریف کا دور ختم ہو چکا۔"حقیقت یہ ہے کہ اب وہ زمانہ نہیں رہا جس میں ڈسپاٹک گورنمنٹ کو لوگ پسند کرتے تھے اور نہ اب وہ بھلائیاں ہیں جو ہزاروں برائیوں کے ساتھ اگلے زمانے کی ڈسپاٹک گورنمنٹ میں ملی ہوئی تھیں۔"(۸۷) استعمار حمایت بیانیہ میں انگریزوں کے مخالف قومیتوں کو برا بیان کیا جاتا تھا۔فرانسیسی انگریزوں کے دشمن رہے ہیں مگر سرسید نہر سویز کے فرانسیسی معمار کی تعریف کرتے ہیں(۸۸) اور پیرس کے بیان میں خوشی خوشی گاڑی کی چھت پہ سفر کرنا بیان کرتے ہیں۔(۸۹)

اہم بات یہ ہے کہ انگریزوں کے دشمن ملک کے شہروں کی جو تعریف سرسید نے کی وہ لندن کی نہیں کی۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ انگلستان کی عظمت نہیں بلکہ فرانس کی عظمت کے گن گا کر اپنے مسلمان قارئین کو سنانا چاہ رہے تھے۔اس کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ لندن پہنچ کر ان کا سفرنامہ ختم ہو گیا۔انھوں نے جو خصوصی تعریفیں کیں ان میں نپولین کی بھی تعریف شامل تھی جو انگریزوں کے نزدیک بڑا دشمن تھا۔سرسید اس کے بارے میں لکھتے ہیں"درحقیقت اس تصویر میں شہنشاہ نپولین پر شہنشاہی برس رہی ہے اور تمام قوم فرنچ کا فخر اور عزت اور سویلیزیشن کی آراستگی اس سے معلوم ہوتی ہے۔"(۹۰) اسی طرح سے فرانسیسی فوج کو بھی نمایاں بیان کرتے ہیں جس کو Salience کی مد میں انگریزی بیانیہ کے مخالف ایک بیانیہ کھڑا کرنا سمجھا جائے گا۔(۹۱)

مندرجہ بالا بیانیہ سرسید کے غور و خوض کے بعد کیے گئے انتخاب کا نتیجہ تھا جس کا پتہ سرسید کے اس جملہ سے چلتا ہے کہ انھوں نے صرف ان کو بیان کرنا چاہا جو ان کے ساتھ واقعی خوش اخلاقی سے پیش آئے(۹۲) یا جن سے خصوصی انداز میں ملاقاتیں ہوئیں(۹۳) پس مس کارپینٹر کا خصوصی ذکر آیا جب کہ سرسید کو انگریزی نہیں آتی تھی اور مس کارپینٹر اردو سے نابلد تھیں(۹۴) اس کے باوجود سرسید نے ان کی کتاب میں ایک نوٹ لکھنا پسند کیا۔میجر پسنگو کے ساتھ سرسید فارسی میں گفتگو کرتے رہے(۹۵) اور فرامجی مہربان جی کے ساتھ گفتگو اردو اور گجراتی کی مماثلت سے متعلق سوچ کو جنم دیتی ہے۔(۹۶) سرسید خود کو

نوآبادیاتی نظام کے ترجمان افراد سے جدا تصور کرتے ہیں اور اس کو ردِ استعمار بیانیہ کے لیے استعمال کرنے کی خاطر ان لوگوں کا خصوصی ذکر کرتے ہیں جنھوں نے ان کو مذہبی اور سیاسی اختلافی بحث میں کھینچنے کی کوشش کی۔ایسے افراد کے بیان میں سرسید نوآبادیاتی نظام کے خلاف ایک مسلم بیانیہ منتخب کر کے اپنی گروہی شناخت کو ان کے گروہی بیانیہ کے خلاف اپنے نظریہ کی وضاحت کرتے ہیں۔ پس لیفٹیننٹ لارنس نے سرسید کو بین المذاہب اختلافات کی بحث میں الجھانا چاہا (۹۷) تو سرسید نے اپنے بیان میں ان سے برابری کی بنیاد پر مکالمہ کرنے کا ذکر کرتے ہوئے ان کو کرارے جواب دیے جس سے ان کے قارئین کو ایسے انگریزوں سے گفتگو کا سبق مل سکے۔

لارنس کے اس بیانیہ پر کہ تمام دنیاوی قوت حکمت اور نعمتیں عیسائیوں کے پاس تھیں سرسید نے کہا کہ ''یہ سب باتیں دنیا کے کاموں سے متعلق ہیں، ان سے اور مذہب کے سچے یا جھوٹے ہونے سے کچھ واسطہ نہیں ہے'' (۹۸) اور دلیل دی کہ ایوب اور کرائسٹ کے تذکرے میں بائبل کہتی ہے کہ ''نیک بندوں کے لیے دنیا نہیں ہے بلکہ دوسری زندگی کی نعمت ہے۔'' (۹۹) اس مکالمہ میں مضمر ہے کہ انگریز اپنی تمام تر دنیاوی کامیابیوں کے باوجود خدا کے نیک بندوں میں شمار نہیں ہوتے۔سرسید نے یہ ملاقات تفصیل سے رقم کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے مسلمان قارئین کو اس طرح کے خیالات پڑھوانا چاہتے تھے۔اپنے سفر کے دوران جس کے بعد ان کو انگریزی اعزازات ملنے تھے یہ تحریر کر کے سرسید نہ صرف اپنے اعزازات بلکہ اپنے سرکاری منصب کو بھی خطرے میں ڈال رہے تھے۔جاسوسی کا نظام اس وقت بھی فعال تھا اور ملکہ ایلزبتھ اول کے زمانے سے مخالفین کو خاموش کرانے کا کام بھی جاری تھا۔مگر سرسید ایسا لکھنے سے اور انگریزوں کے منہ پر کلمۂ حق کہنے سے باز نہ آئے۔

انگریزوں کے اخلاق کے تعریفوں کے ساتھ ساتھ ان کے خیالات میں ذہنی وسعت کا نہ ہونا بھی سرسید کے بیانیہ میں شامل ہے۔اسی طرح دہلی کے سابق ڈپٹی کمشنر فٹز پیٹرک پنجاب کے نظام حکومت پر گفتگو کے بیان میں سرسید نے تحریر کیا کہ کس طرح انھوں نے برملا کہا کہ آمریت کی حکومت کا زمانہ لد چکا ہے۔(۱۰۰) اس طرح کے واقعات کا سفر نامہ میں بیان کرنا جب کہ یہ سفر نامہ ساتھ ہی ساتھ ہندوستان میں شائع ہو رہا تھا اس بات کا ثبوت ہے کہ سرسید مسلمانوں کو ایک ردِ استعمار بیانیہ پڑھوا رہے تھے جس کو انگریز حاکم باغیانہ تصور کر سکتے تھے۔انگریزی حکومت کے ایک حکم نامے کے ذکر میں جس کے ذریعہ گورنر جنرل کو زیادہ اختیارات دیے گئے تھے، سرسید نے لکھا کہ حقیقت یہ ہے کہ اس حکم نامے کے ذریعہ ہندوستان کو غلام بنا لیا گیا ہے اور اس کے برے نتائج برآمد ہو نگے۔

انگریزی فوج اور حکومت کا ذکر سرسید اس وقت کرتے ہیں جب انھوں نے مسلم علاقوں پر انگریز قبضے کا ذکر کرنا ہوتا ہے۔جیسا کہ عدن کے باب میں (۱۰۱) انھوں نے عدن کی فوجی اہمیت واضح کی ''عدن

ہندوستان کی حفاظت کا پہلا نا کہ ہے اور بحر احمر کی کنجی ہے ۔ہندوستان میں اگر کچھ فساد ہو تو چھ روز میں یہاں سے ہر قسم کے سامان حرب کی مدد ہندوستان میں پہنچ سکتی ہے اور اگر والی مصر سے کچھ بگاڑ ہو یا فرانسیسی مصر پر کچھ فساد کریں تو فی الفور عدن سے وہاں حملہ ہوسکتا ہے۔" (۱۰۲) سرسید نے گیری بالڈی کو بھی ولا ورا عظم کہا (۱۰۳) اور اس کی رہائش گاہ دیکھنے کی خواہش کی۔ "میں اس زمانے کے سب سے بڑے فیاض دلاور گیری بالڈی کے پھونس کے جھونپڑے کی جو بڑے بڑے قیصروں کے محلوں سے بھی زیادہ معزز اور قابل ادب وتعظیم ہے زیارت کروں۔" (۱۰۴) اسی طرح سرسید نے فرانس کی سڑکوں کے نظاروں کو بالکل ویسے ہی بیان کیا جسے ہندوستانی سیاحوں نے لندن کا بیان کیا ہے۔

سرسید انگریزی زبان جاننے کی ضرورت پر زور دینے کے بجائے کئی زبانوں کو جاننے کی اہمیت واضح کرتے ہیں۔ان کے بیانیہ میں فرانسیسی سلیز گرلز (۱۰۵) اور ایک مسلم آیا (۱۰۶) کا ذکر مختلف زبانیں جاننے کے فوائد کے طور پر آیا ہے۔ایسے وقت میں جب انگریزی زبان اور تعلیم کی افادیت نوآبادیاتی حکومت کی اولین ترجیح تھی ، سرسید اردو زبان کی ترویج اور تعلیم پر زور دیتے نظر آتے ہیں۔انھیں پارسی لڑکیوں کی تعلیم پسند لیکن ان کا انگریزی زبان پڑھنا سخت ناپسند لگا "مگر میں نہیں سمجھا کہ اپنی زبان چھوڑ کر پارسیوں کو لڑکیوں کے انگریزی پڑھانے لکھانے کی کیا ضرورت پیش آئی ہے۔" (۱۰۷) انھوں نے زور دے کے لکھا کہ انھیں الہ آباد سے بمبئی تک ہر جگہ اردو نظر آئی "کچھ شبہ نہیں کہ تمام ہندوستان میں اردو زبان اسی طرح سمجھی اور بولی جاتی ہے جیسے تمام یورپ میں فرنچ بلکہ اس سے بھی زیادہ مروج ہے۔" (۱۰۸) عدن میں بھی انھیں اردو ملی (۱۰۹) اور وہ گجراتی میں بھی فارسی اور اردو الفاظ تلاش کرتے رہے۔ (۱۱۰) اس کے ساتھ انھوں نے اپنی زبان میں علم حاصل کرنے پر زور دیا۔(۱۱۱) انھوں نے ہندوستان سے باہر اردو، عربی اور فارسی میں بے تکلف گفتگو کرنا بیان کیا ہے (۱۱۲) اور انگریزی کے بجائے مادری زبان میں تعلیم کا بیانیہ رقم کیا (۱۱۳) یہ ان کے دوسرے انگریز مخالف بیانیے کا حصہ تھا۔(۱۱۴) سرسید تاریخ میں یہاں تک مبالغہ کرتے ہیں کہ صفائی میں پیرس کا میونسپل محکمہ جنت میں داخلہ کا سب سے اہل ہوگا۔(۱۱۵) اس کے مقابلے میں سرسید انگریزی نظام حکومت کی تعریفوں کے بجائے اس کے نقائص بیان کرتے نظر آتے ہیں۔بمبئی کے بیان میں (۱۱۶) بہت سے مصنفین اس شہر کو انگریزی حکومت کے عظیم نشان کے طور پہ بیان کرتے آئے تھے مگر سرسید کو یہاں ریلوے اسٹیشن پر ہر جگہ غربت نظر آئی (۱۱۷) اور انھیں یہاں ہندوستان سے کوئی ثقافتی مماثلت دکھائی نہ دی۔(۱۱۸)

سرسید کو کئی جگہوں پر ہندوستان کے فن تعمیر کی یاد آتی رہی اور وہ تاج محل اور قطب مینار سے فرانسیسی عمارات کا موازنہ کرتے رہے (۱۱۹) اور ایک جگہ انھوں نے لکھا کہ ہندوستان کی عمارات زیادہ مضبوط، حسین اور باوقار رہیں۔(۱۲۰)

سرسید کو تصاویر اور عجائب گھر کی استعماری بیانیہ میں اہمیت کا بھی علم تھا جیسا کہ پیرس کے شاہی محل کی تصاویر کے بیان میں انھوں نے لکھا کہ وہ قومی جذبہ اُبھارنے کا ذریعہ تھیں۔(۱۴۱) جب انھوں نے الجزائری مجاہد آزادی امام عبدالقادر کے خاندان کی خواتین کی گرفتاری کی تصویر دیکھی تو اسے برطانوی تہذیب اور حمیت پہ دھبہ قرار دیا (۱۴۲) اور انھوں نے سوال کیا کہ ایسی تصاویر آویزاں کرنا کیا فرانسیسیوں کو زیب دیتا ہے۔ ردِ استعمار کے بیانیہ کو رقم کرتے ہوئے انھوں نے عبدالقادر کو ایک بہادر جنگ جو قرار دیا (۱۴۳) جب کہ اسی طرح کے ہندوستانی مجاہدین آزادی کو صرف ایک دہائی قبل انگریز تختہ دار پہ لٹکا چکے تھے۔اس طرح کے ردِاستعمار واقعات اور بیانات ظاہر کرتے ہیں کہ سرسید کو قصہ گوئی، اس کے استعمال اور مقام کا مکمل ادراک تھا اور اپنے بیانیہ میں ان کی فعالیت کا مفید استعمال کرنا چاہتے تھے۔

اس تجزیہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سرسید کا یہ سفرنامہ ایک نظریاتی دستاویز ہے اور اگرچہ سرسید نے سفر کے بعد سوچ سمجھ کر اسے رقم نہیں کیا مگر اس میں واقعات اور کردار کے انتخاب اور ان کو نمایاں کرنے اور ترتیب دینے میں ردِاستعمار نظریات کارفرما تھے۔اس سفرنامہ کا اردو میں شائع کرنا بھی ایک ردِاستعمار تکنیک تھی جیسا کہ انگریزوں کو بحیثیت انسان نہ کہ بحیثیت حاکم بیان کرنا ایک نوآبادیاتی نظام کے خلاف بیانیہ قائم کرنے کی کوشش تھی۔سرسید کے سفرنامہ میں انگلستان کے جاہ وجلال کو بیان نہ کرنا بھی ردِاستعماری تکنیک کا استعمال تھا جس کے ذریعے انھوں نے انگریزی عمارات واشیا کو بارعب قرار دینے کے بجائے ان کو یوں بیان کیا کہ جیسے ان کو سمجھ کے ہندوستانی انھیں خود بھی بنا سکتے تھے۔ان انگریزی جلال کے ذرائع کو انھوں نے فرانسیسی اشیا کے مقابل رکھ کے اور فرانسیسی کی تعریف کر کے ان کی اہمیت کم کر دی جس سے استعماری طاقت میں کمی رقم ہوئی۔سرسید کی اس تکنیک وحکمت عملی سے ان کا سفرنامہ ایک عظیم ردِاستعمار تحریر ثابت ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) سرسید احمد خان، مسافرانِ لندن، مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۹ء

(۲)Khan, Sir Syed Ahmad, A Voyage to Modernism, trans. Mushirul Hasan and Nishat Zaidi, Delhi: Primus Books. 2011.

(۳) سرسید احمد خان، مسافران لندن، ص ۱۳۷

(۴) ایضاً: ص ۲۸۔۲۹

(۵)Prince, Gerald. Narratology: The Form and Function of Narrative, Berlin: Mouton Publishers. 1982

(۶)Genette, Gerard, Paratexts: Thresholds of Interpretation, Cambridge University Press, 1997

(٧)Bal, Mieke Ed: Introduction to the Theory of Narrative, Toronto: University Of Toronto Press. 1999. Print.

(٨)Chatman, Seymour B. Story and Discourse: Narrative Structure in Fiction and Film. Ithaca, New York: Cornell University Press, 1978.

(٩)Chatman, Saymour B, Coming to Terms: The Rhetoric of Narrative in Fiction and Film, Cornell University Press, 1990

(١٠)Chatman, Saymour B, Coming to Terms: The Rhetoric of Narrative in Fiction and Film, Cornell University Press, 1993

(١١)Rimmon-Kenan, Shlomith, Narrative Fiction, London: Routledge, 2005

(١٢)Bhabha, Homi K., Nation and Narration, London: Koutledge, 1990, P. 292

(١٣)De Fina, Anna. Narratives and Identities, Anna De Fina, and Alexandra Georgakopoulou, Eds. The Handbook of Narrative Analysis.Malden, MA: John Wiley & Sons Inc. 2015, P.161

(١٤)Riessman, Catherine Kohler ."Narrative Analysis", Narrative, Memory & Everyday Life. University of Huddersfield.2005, P.1

(١٥)Booth, Wayne C. The Rhetoric of Fiction. Chicago: University of Chicago Press. 2nd Edition. 1983

(١٦)Phelan, James, Narrative as Phetoric: Technigue, Audience Ethics, Ideology, Columbus: Ohie State University Press, 1996

(١٧)Phelan, James. "Rhetoric /ethics".The Cambridge Companion to Narrative. David Herman. Ed. Cambridge: Cambridge University Press, 2007, P.502

(١٨)Phelan, James, "Ghe Approaches" David Hermon James Phelan Peter J Raminowitz, (ds) Narrative Theory: Core Concepts and Critical Debaies Chio, State University Press 2012, P.502

(١٩)Phelan, James and Peter J. Rabinowitz (edit). A Companion to Narrative Theory, Blackwell Publishing Ltd., 2005

(٢٠)Toolan, Michael, "Language", David Herman. Ed. The Cambridge Companion to Narrative, Cambridge: Cambridge University Press 2007, P.231

(٢١)Ibid, P.502

(٢٢)Abbott, Porter, The Cambridge, Iniroduction to Narrative, Cambridge: Cambridge University Press, 2002, P.36

(۲۳)Mills, Sara. Discourses of Difference: An Analysis of Women's Travel Writing and Colonialism. London: Routledge, 1991

(۲۴)Said, Edward W. Orientalism. New York: Vintage Books, 1979

(۲۵)Neyer, Pramod K., Colonial Voices: The Discourses of Empire, John Wiley and sons. Inc. 2012

(۲۶)Riessman, Catherine Kohler. "Narrative Analysis" Narrative, Memory and Everyday Life. University of Huddersfield, 2005, P.4

(۲۷)Hogan, Patrick C. Understanding Nationalism: On Narrative, Cognitive Science, and Identity. Columbus, Ohio: Ohio State University Press, 2009

(۲۸)Ibid, p.66

(۲۹)Ibid. p93

(۳۰)Ibid, p.168

(۳۱)De Fina, Anna. Narratives and Identities, Anna De Fina, and Alexandra Georgakopoulou, Eds. The Handbook of Narrative Analysis.Malden, MA: John Wiley & Sons Inc. 2015

(۳۲)Ibid, p6

(۳۳)Ibid, pp.179-180

(۳۴)Riessman, Catherine Kholer, "Anolgsis of Personal Narratives" Https: //www.ued.ac.uk/ www.medis/microsites/cnr/documents/ riess1. doc.Accessed 22 July, 2016

(۳۵)Booth, Wayne C., "Resurrection of the Implied Author; Why Bother?" James Phelan and Peier J. Rabinowitz, Eds. A companion to Narrative Theory, Blackwell Publishing, 2005, pp,77-78

(۳۶)Ibid, p, 78

(۳۷)Ibid, p.77

(۳۸)Hogen, Patrick c., Understanding Nationalism: On narrative, cognitive Science and Identity, Columbus: Olio state University Press, 2009, pp,9,30,58,67-871

(۳۹)سرسید احمد خاں، مسافران لندن، ص ۲۲_۲۴

(۴۰)Muir, William, The lif of Mahomd, London: Smith, Elder and co. 1861.

(۴۱)سرسید احمد خاں، مسافران لندن، ص ۱۹۲ تا ۱۹۳_۱۹۷ تا ۲۰۶

(۴۲)ایضاً، ص ۱۵۰

(۴۳) ایضاً، ۴۷

(۴۴) ایضاً، ص ۵۶

(۴۵) ایضاً، ص ۱۰۷

(۴۶) ایضاً،ص ۱۴۷

(۴۷) ایضاً،ص ۴۹،۷۴،۱۳۸،۱۳۹

(۴۸) ایضاً،ص ۱۴۸،۱۴۹،۱۵۰

(۴۹) ایضاً، ۴۵، ۴۶،۱۴۲

(۵۰) ایضاً،ص ۸۹

(۵۱) ایضاً،ص ۳۶،۴۷

(۵۲) ایضاً،ص ۵۲

(۵۳) Booth, Waync C., The Rhetoric of Fiction chicago: University of Chicago Press, 1983.

(۵۴) سر سید احمد خان، مسافرانِ لندن، ص ۱۹۴

(۵۵) ایضاً،ص ۱۹۳

(۵۶) ایضاً،ص ۱۵۴

(۵۷) ایضاً،ص ۲۸،۳۰،۵۳،۱۵۲

(۵۸) ایضاً،ص ۱۹۳

(۵۹) ایضاً

(۶۰) ایضاً

(۶۱) ایضاً،ص ۱۸۷

(۶۲) ایضاً،ص ۱۸۴

(۶۳) ایضاً،ص ۴۲

(۶۴) ایضاً،ص ۴۳

(۶۵) ایضاً،ص ۶۳

(۶۷) ایضاً،ص ۹۱

(۶۸) ایضاً،ص ۱۳۶

(۶۹) ایضاً

(۷۰) ایضاً

(۷۱) ایضاً،ص ۹۴

(۷۲) ایضاً

(۷۳) ایضاً،ص ۳۹،۴۰، ۴۹

(۷۴) ایضاً،ص ۴۸_۵۰

(۷۵) ایضاً،ص ۸۵

(۷۶) ایضاً،ص ۷۲

(۷۷) ایضاً،ص ۴۰

(۷۸) ایضاً،ص ۶۳،۶۴

(۷۹) ایضاً،ص ۱۰۸_۱۰۷

(۸۰) ایضاً،ص ۱۰۸

(۸۱) ایضاً،ص ۷۵

(۸۲) ایضاً

(۸۳) ایضاً،ص ۷۶

(۸۴) ایضاً،ص ۶۶، ۶۷

(۸۵) ایضاً،ص ۶۸

(۸۶) ایضاً،ص ۶۸،۱۰۴

(۸۷) ایضاً،ص ۱۰۵

(۸۸) ایضاً،ص ۷_۱۰۶

(۸۹) ایضاً،ص ۱۲۹ تا ۱۳۲

(۹۰) ایضاً،ص ۱۲۹

(۹۱) ایضاً،ص ۱۱۰،۱۳۱

(۹۲) ایضاً،ص ۶۳

(۹۳) ایضاً،ص ۸۶

(۹۴) ایضاً،ص ۶۴، ۶۵

(۹۵) ایضاً،ص ۷۱

(۹۶) ایضاً،ص ۶۹ تا ۷۱

(۹۷) ایضاً،صص ۶۶ تا ۶۸

(۹۸) ایضاً،ص ۶۶

(۹۹) ایضاً

(۱۰۰) ایضاً،ص ۱۰۴،۱۰۵

(۱۰۱) ایضاً،ص ۸۶،۸۷

(۱۰۲) ایضاً،ص ۸۷

(۱۰۳) ایضاً،ص ۱۰۹

(۱۰۴) ایضاً

(۱۰۵) ایضاً،ص ۱۳۵

(۱۰۶) ایضاً،ص ۱۰۸

(۱۰۷) ایضاً،ص ۵۷

(۱۰۸) ایضاً،ص ۴۷

(۱۰۹) ایضاً،ص ۸۵

(۱۱۰) ایضاً،ص ۶۹ تا ۷۱

(۱۱۱) ایضاً،ص ۹۲

(۱۱۲) ایضاً،ص ۵۷،۶۳،۹۲،۶۹،۷۰،۷۱

(۱۱۳) ایضاً،ص ۱۰۱

(۱۱۴) ایضاً،ص ۴۵،۱۰۴،۱۰۵،۱۲۸

(۱۱۵) ایضاً،ص ۱۴۲

(۱۱۶) ایضاً،ص ۵۴ تا ۷۰

(۱۱۷) ایضاً،ص ۵۴

(۱۱۸) ایضاً،ص ۷۶

(۱۱۹) ایضاً،ص ۸۶، ۸۷، ۹۸، ۱۱۶، ۱۲۱

(۱۲۰) ایضاً،ص ۱۳۶

(۱۲۱) ایضاً،ص ۱۳۸

(۱۲۲) ایضاً،ص ۱۳۹

(۱۲۳) ایضاً،ص ۱۳۹،۱۴۰